ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

"سیرۃ النعمان رض" پر ایک نظر

"ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی زیرِ طبع تصنیف 'یادگارِ شبلی' کا ایک باب۔ اس تصنیف میں علامہ شبلی نعمانی کے مفصل حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔" مدیر

مولانا شبلی کی تیسری قابلِ ذکر تصنیف اور دوسری اہم سوانح عمری سیرۃ النعمان ہے۔ علامہ کو امام اعظم ابوحنیفہ رض سے جو تعلقِ خاطر تھا، اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اس موانست کی بنا پر ان کا لقب نعمانی ہوا جو ان کے اور ان کی اولاد کے نام کا جزو ہو گیا۔ سید سلیمان کے خیال میں یہی جذبہ سیرۃ النعمان کی تصنیف کا باعث ہوا۔ لیکن شاید ایک بڑا محرک یہ تھا کہ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے جو عقلیت، حقیقت پسندی، میانہ روی اسلامی نظامِ قانون کو برسرِ کار لانے کے لیے مولانا ضروری سمجھتے تھے۔ اس میں امام اعظم کے طریقِ کار سے بڑی مدد ملتی تھی۔ النعمان کا پہلا حصہ جو سوانحی ہے ۱۸۸۹ء میں لکھا گیا۔ دوسرا حصہ ۱۸۹۰ء میں شروع ہوا، اور اسی سال کے آخر یعنی دسمبر ۱۸۹۰ء میں ختم ہوا۔ اس حصے میں امام اعظم کے مذہبی کارناموں پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔

سیرۃ النعمان کے شروع میں جو دیباچہ ہے، اس کا المامون کے دیباچے سے مقابلہ کریں تو مولانا کے خیالات میں ایک لطیف لیکن اہم تبدیلی نظر آتی ہے۔ جس وقت المامون لکھی گئی، اس وقت مولانا کا ارادہ تھا کہ "اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور بسیط تاریخ" لکھی جائے۔ اس مقصد کے لیے "رائل ہیروز آف اسلام" (یعنی نامور فرمانروایانِ اسلام) کا ایک سلسلہ قائم کیا۔ اور اسلامی تاریخ کے دس اہم سلسلوں میں سے ایک ایک نامور منتخب ہوا۔ جن کی فہرست مولانا نے المامون کے آغاز میں درج کی۔ مولانا کا یہ دعویٰ اہم تھا کہ ان دس فرمانرواؤں کے حالات ترتیب و جامعیت سے لکھیں گے۔ "یہ قطعی ارادہ ہے کہ اگر زمانہ نے مساعدت اور عمر نے وفا کی تو اس سلسلے کے کُل حصے جس طرح ہو سکے گا، پورے کروں گا۔"

المامون کے بعد (الفاروق یعنی) خلیفہ دوم حضرت عمر رض کی سوانح حیات شروع ہوئی۔ جس کا ذکر

ابتدائی پروگرام میں ہو چکا تھا۔ اس کا "معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا۔ لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔" وجہ اس کی انھوں نے سیرۃ النعمان کے دیباچے میں یہ دی ہے کہ بعض نادر کتابیں جو الفاروق کے لیے ضروری تھیں، یورپ میں چھپ رہی تھیں۔ ان کے بغیر کتاب خاطر خواہ طور پر لکھی نہ جا سکتی تھی۔ اور ان کے شائع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ چنانچہ انھوں نے سیرۃ النعمان شروع کی۔ لیکن اس سے ان کے پروگرام میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی۔ المامون کے شروع میں انھوں نے " رائل ہیروز آف اسلام (یعنی نامور فرمانروایان اسلام)" کا پروگرام پیش کیا تھا۔ سیرت النعمان کے دیباچہ میں یہ سلسلہ " ناموران اسلام" بن گیا۔ فقط حکمرانوں کے لیے وقف نہ رہا۔ اس دیباچہ میں انھوں نے لکھا کہ ان کا شروع سے خیال تھا کہ سلطنت کے مختلف خاندانوں کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں۔ اور ان کے ناموروں کے حالات درج ہوں لیکن چونکہ یہ کام بہت وسیع تھا۔ انھوں نے "حیثیت حکومت کی قید" لگائی۔ الفاروق کی تالیف رُکی تو ان پر پھر یہ خیال غالب آیا " کہ علمی نام آوروں کے کارنامے دکھانے بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ اسلام میں تیغ و قلم کا ہمیشہ (کذا) ساتھ رہا ہے"۔ موخر الذکر اظہار ایک صفحے پر دو جگہ ہوا ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں "السیف والقلم توامان"۔ اس بنا پر فیصلہ ہوا کہ "چند روز کے لیے خاندان حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کی جائے۔ چنانچہ فقہ کے بانی امام اعظمؒ کی سیرت (لائف) شروع ہوئی۔ لیکن انھوں نے فقط " چند روز کے لیے خاندان حکومت" کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ سوائے الفاروق کو مکمل کرنے کے، اس کے بعد انھوں نے " نامور فرمانروایان اسلام" کا سلسلہ یک قلم ترک کر دیا۔ اور باقی آٹھ " رائل ہیروز آف اسلام" میں سے کسی کے حالات نہیں لکھے۔

علامہ کے ابتدائی پروگرام کی نسبت شاید بہت لوگوں کو حسرت ہوگی کہ کاش وہ قلم جس نے الفاروق لکھی، کم از کم سلطان صلاح الدین ایوبی کے کارنامے لکھ سکتا۔ لیکن اپنے موضوع کو وسعت دینے کا جو خیال انھوں نے سیرت النعمان کے دیباچہ میں ظاہر کیا تھا، مبارک خیال تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ان کا ہموار طبیعت آہستہ آہستہ سیاسی تاریخ کے میدان کو چھوڑ کر مذہب، کلام، ادب (اور قومی قیادت) کے مرغزاروں کا رُخ کر رہا تھا۔ اور اس دیباچے سے اس عمل کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مولانا نے سیرۃ النعمان دل لگا کر اور بڑی کاوش سے لکھی۔ امام اعظمؒ کے ایسے محب سے جس کا

لقب ہی نعمانی تھا، یہی توقع ہو سکتی تھی۔ مولانا اپنے استاد مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رام پوری کو جو پُر جوش حنفی تھے، لکھتے ہیں: "علازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جد و جہد سے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں، جس کے لیے میں نے بہت سے مواد تاریخی فراہم کیے"۔ مولوی حکیم محمد عمر کے نام ایک خط میں ہے "اس کتاب (سیرۃ النعمان) کی تصنیف میں بڑی خاک چھاننی پڑی۔ بہت سے کتب خانے دیکھنے پڑے"۔

سیرۃ النعمان کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ سوانحی ہے جس میں امام اعظمؒ کے حالاتِ زندگی اور ان کے اخلاق و عادات پر تبصرہ ہے۔ امام صاحب ۸۰ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان عجمی تھا۔ آبائی پیشہ تجارت تھا۔ انھوں نے کسبِ معاش کے لیے اسی کو برقرار رکھا اور اپنی ذہانت و قابلیت سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن جب اخذِ علوم کی طرف توجہ ہوئی تو اسے بھی پایۂ کمال کو پہنچا دیا۔ حدیث کی تعلیم شروع کی تو کوفہ۔ بصرہ۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ میں جہاں کہیں فیض کا چشمہ تھا، اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ اور پھر (تجارت کے ساتھ ساتھ) درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جس سے فیض پانے کے لیے دور دور کے ملکوں سے اہلِ علم کھنچ کر آتے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ کا عراق میں اتنا اثر قائم ہوگیا کہ ملکی معاملات میں بھی آپ کی مدد مانگی جانے لگی۔ یہ زمانہ بنی امیہ کے آخری ایام کا تھا جب ان کے خلاف سازشیں عام تھیں۔ کوفہ کے گورنر نے چاہا کہ دینی زعما کی شرکت سے حکومت کو تقویت دے۔ چنانچہ عراق کے مشہور فقہا کو بلا کر بڑی بڑی ملکی خدمتیں دی گئیں۔ امام صاحب سے بھی کہا گیا کہ وہ میر منشی اور افسر خزانہ ہو جائیں۔ انھوں نے صاف انکار کیا۔ بعض روایتیں ہیں کہ ان سے قضا کے قبول کرنے کے لیے کہا گیا۔ لیکن انھوں نے کسی عہدہ کے لینے سے انکار کیا۔ اور گورنر کے اصرار پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ اس نے غصہ میں آکر حکم دیا کہ ان کو ہر روز دس دُرّے لگائے جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ لیکن امام صاحب اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ آخر مجبور ہو کر گورنر نے چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد امویوں کا تختہ الٹ گیا۔ اور ۱۳۲ھ میں عباسی برسرِ اقتدار ہوئے۔ ان کی حکومت نئی نئی تھی۔ اور جا بجا اس کی مخالفتیں ہو رہی تھیں، جنھیں فرو کرنے کے لیے پہلے عباسی فرمانروا ابوالعباس سفاح اور اس کے جانشین منصور نے وہ سختیاں اور بے رحمیاں کیں کہ بقول شبلی ان کے "بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیے"۔ بہر کیف منصور نے امام صاحب کو بغداد میں بلا بھیجا۔ اور عہدۂ قضا قبول کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے انکار کیا۔ خلیفہ نے اصرار کیا۔ لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ غالباً اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو وہ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ساتھ وابستہ ہو جانے سے ان کی آزادیٔ فکر

کو ضعف پہنچے گا۔ دوسرے اس زمانے کے دوسرے علمائے کبار، مثلاً امام مالک کی طرح، ان کی ہمدردیاں عباسیوں کے مخالف سادات سے تھیں۔ ان کے مسلسل انکار پر منصور نے انھیں قید کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۴۶ھ کا ہے۔ لیکن قید خانے میں بھی ان کا سلسلہ تعلیم جاری رہا۔ امام اعظمؒ کے دو بڑے شاگرد تھے۔ جنھیں فقہ حنفی کا دست و بازو اور صاحبین کہا جاتا ہے۔ ایک قاضی ابو یوسف جنھیں ہارون الرشید نے تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ اور جن کا فقہ حنفی کی ترویج میں بڑا حصہ تھا۔ دوسرے امام محمد بن الحسن شیبانی۔ امام اعظم کی تو کوئی تصنیف نہیں ملتی۔ البتہ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج موجود ہے جس کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ لیکن اس وقت فقہ حنفی کا زیادہ دارومدار امام محمد کی تالیفات پر ہے۔ ان میں سے مبسوط اصل میں "قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے۔ ان ہی مسائل کو امام محمد نے زیادہ توضیح اور خوبی سے لکھا۔" مبسوط کے بعد امام محمد نے جامع صغیر مرتب کی، جس میں قاضی ابو یوسف کی روایت سے امام ابو حنیفہ کے اقوال، مختلف مسائل کے متعلق لکھے ہیں۔ اس کے بعد جامع کبیر مرتب ہوئی، جس میں امام محمد نے امام ابو حنیفہ کے اقوال کے ساتھ قاضی ابو یوسف اور (امام ابو حنیفہؒ کے ایک اور ممتاز شاگرد) امام زفر کے اقوال درج کیے ہیں۔ اور ہر مسئلہ کے ساتھ دلیل بھی لکھی ہے۔ جامع کبیر کی ترتیب کے بعد امام محمد کو جو اقوال یاد آئے، انھیں آپ نے زیادات میں جمع کیا۔ امام محمد نے مذکورہ بالا کتب کے علاوہ دوسری کتابیں بھی تصنیف کیں۔ لیکن ان چار کتابوں سے ہی اس اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو انھیں فقہ حنفی کی تاریخ میں حاصل ہے۔ امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے قید خانہ میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔

امام اعظمؒ نے فیض رسانی کا سلسلہ قید میں بھی جاری رکھا۔ لیکن اس سے منصور کے اندیشے اور بڑھ گئے۔ چنانچہ اس نے انھیں زہر دلوا دیا، جس کے اثر سے انھوں نے (رجب ۱۵۰ھ میں) قضا کی۔

مندرجہ بالا حالات سیرت النعمان حصہ اول سے لیے گئے ہیں۔ اس حصہ میں دو تین مباحث کا تفصیلی بیان ہے۔ ایک تو امام اعظمؒ نے تحصیل حدیث میں جو اہتمام کیا، اس کا مفصل ذکر ہے۔ اور ان متعدد بزرگوں کے بھی، جو امام صاحب کے شیوخ حدیث تھے، مختصر حالات لکھے ہیں۔ دوسرا اہم موضوع امام اعظمؒ کے اخلاق و عادات کا ہے، جس سے نہ صرف ان کی بلندیٔ کردار، غیر معمولی

ذہانت، حلم وہمدردی، رقت طبع، کامیاب تجارت کا وسیع تجربہ، فیاضی، لباس اور طرز معاشرت میں صفائی اور اہتمام، وظیفہ خواری سے اجتناب، اور آزادی اور بے نیازی پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس ذہن کے خدوخال بھی نمایاں ہوتے ہیں، جس نے فقہ اسلامی کے سب سے وسیع سلسلہ کی بنا ڈالی ۔ ایک اہم اندراج میں اس ہدایت نامہ کے طویل اقتباسات ہیں، جو امام صاحب نے قاضی ابو یوسف کے لیے لکھا۔

سیرۃ النعمان کا دوسرا حصہ جو، بقول شبلی ان کی محنتوں کی "تماشا گاہ" ہے، کتاب کی جان ہے۔ اور مصنف کی علمیت، غور و فکر، سلیقۂ استدلال اور مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دینے کی قابلیت کا شاہکار ہے۔ پہلا باب امام صاحب کی تصانیف کے متعلق ہے۔ ان سے جو تصانیف منسوب کی جاتی ہیں، ان کی تفاصیل دے کر آخر میں لکھا ہے "ہماری ذاتی رائے یہی ہے کہ آج امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔" اگلا باب "عقائد و کلام" کے بارے میں ہے۔ امام اعظمؒ کو کلامی مسائل میں تھوڑے عرصے کے لیے ہی دلچسپی رہی۔ اس لیے فقط دو تین مسائل کا ذکر ہے۔" امام ابو حنیفہؒ نے ان تمام بحثوں میں وہی پہلو اختیار کیا، جو مغز سخن تھا۔ اور جو عقل کے ساتھ نقل سے بھی مطابق تھا۔ انہی مسائل میں ایمان و عمل کا مسئلہ تھا۔" جس کے متعلق مولانا شبلی نے امام صاحب کے ایک طولانی خط کے اقتباسات دیے ہیں۔ دوسرا مسئلہ، جس کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ "تکفیر و عدم تکفیر کا ہے۔ اس معاملے میں امام اعظمؒ کا طریق کار تھا" لانکفر احداً من اهل القبلة" یعنی ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے۔

امام اعظم اور حدیث

پہلے دو باب نسبتاً مختصر ہیں۔ ان کے بعد دوسرے حصے کے اصل مباحث شروع ہوتے ہیں۔ پہلے فن حدیث کے متعلق تفصیلی بحث ہے۔ اور واقعات و اسانید سے بتایا ہے کہ فن حدیث میں امام اعظمؒ کا کیا پایہ تھا۔ اور احادیث کے متعلق ان کا طریق کار کیا تھا۔ احادیث کے متعلق امام اعظمؒ کا نقطۂ نظر احناف اور اہل حدیث حضرات میں متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اور اس مسئلہ پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ علامہ شبلی نعمانی سے امام ابو حنیفہؒ (نعمان بن ثابت) کے انداز خیال کی وضاحت اور حمایت ہی متوقع ہے۔ اور انھوں نے یہ کام سریع الفہمی اور موثر طریقے سے انجام دیا ہے۔ شروع

میں زیادہ بحث اس پر ہے کہ اگرچہ امام اعظمؒ نے حدیث پر بڑی توجہ دی۔ (اور علامہ ذہبی نے حفاظ حدیث کے حالات میں جو مستقل کتاب لکھی۔ اس میں ان کا علیحدہ تذکرہ لکھا۔ اور انھیں حفاظ حدیث میں شمار کیا)۔ لیکن ان کے واسطے سے بہت تھوڑی احادیث بیان ہوئی ہیں۔ اور صحاح ستہ کے مصنفین نے (سوائے ایک دو روایات کے) امام صاحب سے کوئی روایت نہیں کی۔ مولانا اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ یہ خیال "غلط اور بالکل غلط ہے کہ امام ابوحنیفہؒ علم حدیث میں کم مایہ تھے" لیکن بزرگوں کی شہرت اسی صنعت کے ساتھ ہوتی ہے، جو ان کا کمال غالب ہو۔ مجتہد اور محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ اور امام اعظمؒ کا اصل مرتبہ بطور ایک مجتہد کے تھا۔ اس لیے ان کی شہرت بطور محدث کے نہیں ہوئی (جس طرح امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی شہرت بھی محدث کے لقب سے نہیں ہوئی۔ اور امام شافعیؒ کی سند سے تو صحیحین میں ایک روایت بھی موجود نہیں)۔ مولانا شبلی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگرچہ خلفائے اربعہ کو رسول اللہ (صلعم) کے ساتھ دوسرے صحابہ کی نسبت زیادہ جلوت اور خلوت میں رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن ان کی روایت سے بہت تھوڑی احادیث بیان ہوئی ہیں۔ اور حضرت عمرؓ تو "صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیں کم بیان کرو۔" مولانا یہ بھی لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ (اور امام شافعیؒ) کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ امام اعظم "متشدّد فی الروایت" تھے یعنی ان کا صحت احادیث جانچنے کا معیار کڑا تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے صحتِ روایت کے لیے جن شرطوں کو اختیار کیا تھا، ان کی تفصیل سیرت النعمان میں دی گئی ہے۔

امام صاحب کے ان معاصرین کا ذکر کرکے، جنھوں نے علم حدیث میں ان سے زیادہ دلچسپی لی، اور جن کے شیوخِ احادیث کی تعداد امام صاحب کے اساتذہ سے کہیں زیادہ تھی، مولانا لکھتے ہیں:

> "امام ابوحنیفہؒ کو جس بات نے تمام ہم عصروں میں امتیاز دیا وہ اور چیز ہے، جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام، ان کے مراتب کی تفریق۔ امام ابوحنیفہؒ کے بعد علم حدیث کی بہت ترقی ہوئی۔ غیر مرتب اور پریشان حدیثیں یک جا کی گئیں۔ صحاح کا التزام کیا گیا۔ اصولِ حدیث کا مستقل فن قائم ہوگیا۔ جس کے متعلق سینکڑوں بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں۔ زمانہ اس قدر ترقی کرگیا ہے کہ باریک بینی اور دقت آفرینی کی حد نہیں رہی۔ تجربہ اور دقتِ نظر نے سینکڑوں نئے نکتے ایجاد کیے۔ لیکن تنقید احادیث، اصول درایت، امتیاز مراتب میں امام ابوحنیفہؒ کی تحقیق کی

جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھا۔"[51]

فن حدیث میں امام اعظمؒ کے تین مندرجہ بالا امتیازی کارناموں میں سے مولانا سب سے زیادہ اہمیت[52] اصولِ درایت کو دیتے تھے۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"فنِ حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابو حنیفہؒ نے یہ کیا کہ درایت کے اصول قائم کیے۔ اور ان کو احادیث کی تحقیق و تنقید میں برتا۔ فن حدیث کی ایک شاخ یعنی روایت پر ہمارے علما نے جس قدر توجہ کی اس کی کوئی نظیر دنیا کی گزشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ افسوس ہے کہ اصول درایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا۔ حافظ ابن حجر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں۔ لیکن وہ اس قدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اصول حدیث ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ اور بڑی بڑی کتابیں جو اس میں لکھی گئیں، عموماً متداول ہیں۔ لیکن ان سے اصولِ درایت کے متعلق بہت کم واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ یہی اصول فن حدیث کے نہایت ضروری اجزا ہیں۔ یہ عزت صرف امام ابو حنیفہؒ کو حاصل ہے کہ اس فن کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس وقت ان کی نگاہ ان باریک نکتوں پر پہنچی۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درایت کے نظر آتے ہیں۔ اور در حقیقت وہی امام ابو حنیفہؒ کے لیے دلیل راہ بنے۔ لیکن وہ باتیں عام مسائل کے ہجوم میں ایسی کم اور ناپید تھیں کہ ان پر عام لوگوں کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔"[53]

فقہ حنفی

حدیث میں امام اعظمؒ کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا، جس کی توضیح سیرت النعمان میں بڑی قابلیت سے ہوئی ہے۔ لیکن امام صاحب کی صلاحیتوں کا اصل میدان فقہ تھا۔ وہ چار فقہی مذاہب کے ائمہ میں سب سے پہلے تھے۔ اس لیے علامہ شبلی نے انھیں "فقہ کا بانی" قرار دیا ہے۔ لیکن اوّلیت کے علاوہ

---

[51] سیرۃ النعمان، ص ۲۲۷-۲۲۸

[52] علامہ اقبالؒ بھی احادیث کے متعلق امام اعظمؒ کے طریقِ کار کے بڑے معترف تھے۔ لیکن وہ امام صاحب کے دوسرے اصول کار، یعنی روایات میں امتیاز مراتب کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہوں خطبات انگریزی)

[53] سیرۃ النعمان ص ۲۵۸-۲۵۹

عالم اسلام میں سب سے زیادہ رواج فقہ حنفی کو ہے۔ اور اس قبولیت و ترویج کا باعث اس مکتب فکر کی بعض خصوصیات ہیں، جن کی اہمیت عہد حاضر میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔ شبلی نے فقہ کا باب بڑی محنت سے اور دل لگا کر لکھا ہے۔ اس کے بھی دو حصے کیے ہیں۔ پہلا حصہ فقہ کی تاریخ، فقہ حنفی کی تدوین اور اصول فقہ کے متعلق ہے۔ جہاں تک فقہ کی مختصر تاریخ کا تعلق ہے، مولانا نے شاہ ولی اللہؒ کے "ایک نہایت عمدہ مضمون" کا خلاصہ دے دیا ہے۔ اس کے بعد تدوین فقہ حنفی کی تفصیل دی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔ امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا۔ جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی۔ چونکہ یہ کام بہت وسیع اور اہم تھا۔ اس لیے امام صاحب نے اپنے چند نامور شاگردوں کی شرکت سے، جو فقہ کے متعلقہ فنون میں استاد زمانہ تسلیم کیے جاتے تھے، ایک مجلس قائم کی، جس میں مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی۔ اور بحث و تمحیص اور غور و خوض کے بعد ایک رائے قائم کر کے قلم بند کی جاتی۔ تدوین کا یہ سلسلہ امام اعظم کی وفات تک (حتےٰ کہ زمانۂ قید میں بھی) جاری رہا۔ اس مجموعہ کے اجزا جیسے جیسے تیار ہوتے گئے، امام صاحب کی درس گاہ اور ان کے تلامذہ اور قدردانوں کے ذریعے ان کی اشاعت بھی ساتھ ساتھ ہوتی گئی۔ جو مجموعہ امام صاحب کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا، وہ اب ناپید ہے۔ مولانا اس کی دو وجہیں بتاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "اس عہد کی ہزاروں کتابوں میں سے آج ایک کا بھی وجود نہیں۔" دوسرے "امام ابوحنیفہؒ کی تصنیفات کی کم شدگی کی ایک خاص وجہ یہ ہے۔ امام صاحب کا مجموعۂ فقہ اگرچہ بجائے خود مرتب اور خوش اسلوب تھا۔ لیکن قاضی ابو یوسف و امام محمدؒ نے انہی مسائل کو اس تفصیل و توضیح سے لکھا، اور ہر مسئلہ پر استدلال و برہان کے ایسے حاشیے اضافہ کیے کہ انہی کو رواج عام ہو گیا۔ اور اصل ماخذ سے لوگ بے پروا ہو گئے۔" اسی باب میں مولانا نے استنباط احکام کی ابتدا اور اصول فقہ کے قواعد کا ذکر کیا ہے۔ اور مسائل فقہ (اور احادیث) کو تشریعی اور غیر تشریعی میں تقسیم کر کے اس امتیاز کی تفاصیل دی ہیں۔ اور اس اہم مسئلے پر شاہ ولی اللہ کے خیالات نقل کیے ہیں۔

اگلا باب فقہ کے دوسرے حصے سے "جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے" متعلق ہے۔ "اور یہ وہ خاص حصہ ہے، جس میں امام ابوحنیفہؒ علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں۔" مصنف نے تفصیل سے اس امتیاز کی توضیح کی ہے جو امام اعظم کو علمی، دینی اور ذہنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وسیع دنیوی

تجربے کی بنا پر حاصل تھا۔ اور اس سے چونکہ فقہ حنفی کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ یہ تمام اندراج نقل کرنے کے لائق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

" مسلمانوں میں توضیح قانون کا کام ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہبی پیشوا تھے۔ اور زہد و اتقا میں نہایت غور کرتے تھے۔ مذہبی لوگوں میں جو اوصاف نہایت قابل قدر سمجھے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں۔ دنیاوی امور سے علیحدگی۔ کم آمیزی۔ معاملات میں سختی۔ عام واقعات سے بے خبری۔ غیر مذہب والوں سے تنفر۔ یہ تمام اوصاف وہ ہیں جو تمدن کے مخالف ہیں اور جس شخص میں یہ اوصاف اعتدال سے بڑھ کر اور فطرتی ہوں۔ وہ مشکل سے تمدن کی ضروریات کا اندازہ داں ہو سکتا ہے۔ تقدس و پاکیزہ نفسی کے لحاظ سے ان لوگوں کی جس قدر عظمت کی جائے کم ہے، لیکن دنیا اور دنیا والوں کا کام ان سے نہیں چل سکتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت کرخیؒ، شیخ شبلیؒ، داؤد طائی کی عظمت و شان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ واضع قانون نہیں ہو سکتے تھے۔

مجتہدین جنھوں نے فقہ کے تمام سے ملکی اور شخصی قانون بنائے، اگرچہ رہبانیت کی حد سے دور تھے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ تمدن کے ان تمام وسیع تعلقات پر ان کی نگاہ پڑ سکتی ہے، جن سے ان کو عمر بھر کبھی سروکار نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قوانین میں بعض جگہ ایسی سختی اور تنگی پائی جاتی ہے، جس پر مشکل سے عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ وغیرہ کا مذہب ہے کہ نکاح میں بجز ثقات کے کوئی شخص گواہ نہیں ہو سکتا۔ ہمسایہ کو حق شفعہ نہیں پہنچتا۔ بیع بالمعاطاۃ جائز نہیں۔ ذمیوں کی شہادت کسی حال میں قبول نہیں۔ ایک مسلمان سینکڑوں ذمیوں کو بے قصور قتل کر ڈالے تاہم وہ قصاص میں پکڑا نہیں جا سکتا۔ ان مسائل سے دنیا کا کام کیونکر چل سکتا ہے ؟

امام ابوحنیفہؒ اس وصف میں اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے۔ اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مرجعیت اور فصل قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات ان کی نگاہ سے گزر چکے تھے۔ ان کی مجلس افتا بہت بڑی عدالت عالیہ تھی، جس نے لاکھوں مقدمات کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی اور ارکان سلطنت مہمات امور میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ ان کے شاگرد اور ہم نشین

جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ تھی، عموماً وہ لوگ تھے جو منصب قضا پر مامور تھے۔ ان باتوں کے ساتھ خود ان کی طبیعت محتاط اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی۔ وہ ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اور اس کے دقیق نکتوں تک پہنچتے تھے۔"[1]

اسی باب میں مولانا نے فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات ایک ایک کر کے گنائی ہیں۔ اور ان کی تفصیل دی ہے۔ یہ خصوصیات بالاختصار یہ ہیں:

(۱) فقہ حنفی اصول عقلی کے موافق ہے۔

(۲) فقہ حنفی آسان اور سہل ہے۔

(۳) فقہ حنفی میں معاملات کے متعلق جو قاعدے ہیں، نہایت وسیع اور تمدنی ترقیوں کے موافق ہیں۔

علامہ شبلی نے بڑی محنت سے مثالیں جمع کر کے دکھایا ہے کہ ان امور میں فقہ حنفی کو دوسرے فقہی طریقوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس خیال کی تائید مختلف مسائل پر فقہ حنفی اور دوسرے مذاہب کے احکام کو آمنے سامنے رکھ کر کی ہے۔

ایک دلچسپ بحث ان اثرات کی ہے، جو فقہ حنفی پر قوانین کے قدیمی سلسلوں سے وارد ہوئے۔ مولانا لکھتے ہیں: "اس امر سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فقہ حنفی میں بعض ایسے مسائل موجود ہیں، جو عرب اور عراق میں اسلام سے پہلے معمول بہ تھے۔" وہ کہتے ہیں کہ "اس میں فقہ حنفی کی خصوصیت نہیں۔ یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے، جو مسائل آج خاص اسلام کے مسائل خیال کیے جاتے ہیں اور خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے، ان میں متعدد ایسے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں معمول و متداول تھے۔ علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں ان کی تفصیل بھی کی ہے۔"[2] یہ سلسلہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی جاری تھا۔ "حضرت عمرؓ نے خراج و ٹیکس کے متعلق جو قاعدے مقرر کیے، وہ عموماً وہی ہیں، جو نوشیروان عادل نے اپنے زمانۂ حکومت میں وضع کیے تھے اور یہ کچھ توارد نہ تھا۔ بلکہ

---

[1] سیرۃ النعمان (امام اعظمؒ)، ص ۳۲۶ تا ۳۲۸

[2] امام اعظمؒ (سیرۃ النعمان شائع کردہ سٹار بک ڈپو، لاہور) ص ۲۵۰

حضرت عمرؓ نے وانستہ نوشیرواں کی اقتدا کی تھی۔ چنانچہ علامہ طبری و ابن الاثیر نے صاف الفاظ میں تصریح کی ہے۔[۴] لیکن مولانا نے اس توضیح کے ساتھ ہی بعض یورپین مصنفوں کے اس خیال کی تردید کی کہ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کی تدوین میں رومن لا یعنی رومیوں کے قانون سے بہت کچھ مدد لی۔ اور ایک طویل فٹ نوٹ میں، جو کئی صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، لنڈن یونیورسٹی کے ایک لاپروفیسر کی مخالفت کی۔ مولانا کہتے ہیں کہ اگرچہ مسلمانوں نے دولت عباسیہ کے عہد ترقی میں یونان و مصر سے علوم لیے۔" اور بے شبہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے، جو غیر قوموں سے مستفید ہوتے تھے۔ اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں ہی میں وہ گروہ بھی تھا۔ (اور وہی بہت بڑا گروہ تھا) جو اپنے فضل و کمال کے زعم میں غیر قوموں کی طرف کبھی رخ بھی نہیں کرتا تھا۔ مجتہدین اور فقہا اسی گروہ میں داخل ہیں۔ یونان اور روم وغیرہ کی جو کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں، ان کی نہایت مفصل فہرست ہم کو معلوم ہے۔ ان میں فلسفہ، طب، ہندسہ، نجوم، کیمیا، صنعت، تاریخ، لائف، ناول کی ہر قسم کی کتابیں ہیں۔ لیکن قانون کی ایک تصنیف بھی نہیں، جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ فقہا اور مجتہدین جو اسلام میں واضع قانون تھے، غیر قوموں کی خوشہ چینی کو اپنی اصطلاح میں حرام کہتے تھے۔" مولانا کو اعتراف تھا کہ "بعض مسائل میں رومن لا و فقہ اسلام متحد ہیں۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ" اس میں فقہ اسلام کی تخصیص نہیں۔ جن دو قانونوں کا گو وہ کتنے ہی بے تعلق ہوں، آپس میں مقابلہ کیا جائے تو بہت سے مسائل مشترک ثابت ہوں گے۔ اور قدرتاً ایسا ہونا ضروری ہے۔ جب تمام دنیا کے آدمیوں کی ذاتی، تمدنی، ملکی ضرورتیں اکثر متحد اور یکساں ہیں تو ان ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ جو قوانین وضع کیے جائیں گے، ان کے مسائل کا مشترک ہونا کون سے تعجب کی بات ہے:

دو راہرو کہ بیک راہ دوند و یک سمت
عجب نباشد اگر او فتند پے در پے[۵]"

یہ بحث دلچسپ، لیکن بہرکیف ضمنی تھی۔ فقہ کے طویل ابواب کی اہمیت اس میں ہے کہ ان میں علامہ شبلی نے فقہ حنفی کی خصوصیتیں، مصلحتیں اور دوسرے مذاہب فقہی پر اس کی فوقیت، بڑے

---

[۴] امام اعظم [سیرۃ النعمان (شائع کردہ ستارہ بک ڈپو) لاہور] ص ۲۵۱ [۵] سیرۃ النعمان

دل نشین طریقے سے واضح کی ہیں۔ لیکن علامہ نری مداحی کے قائل نہ تھے۔ وہ تصویر کا دوسرا رخ یا کم از کم اس رخ کی ایک جھلک دکھانا ذمہ دار اہل قلم کا فرض سمجھتے تھے۔ فقہ کے طویل اندراج کے آخر میں کہتے ہیں:

"اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے (سب؟) مسائل صحیح اور یقینی ہیں۔ امام ابوحنیفہ مجتہد تھے، پیغمبر نہ تھے۔ اس لیے ان کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے۔ نہ صرف امکان بلکہ وقوع کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خود ان کے خاص شاگردوں نے بہت سے مسائل میں ان کی مخالفت کی۔ مدتِ رضاعت۔ قضائے قاضی کا ظاہراً و باطناً نافذ ہونا۔ قتل بالمثقل۔ نکاح محرمات میں حد کا نہ لازم آنا۔ ان تمام مسائل میں ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کے مذہب کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہو سکتی۔ ایسے اور بھی مسائل ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد اس موقع پر صرف یہ ہے کہ ایک مجتہد کا جس حد تک صائب الرائے ہونا ممکن ہے۔ امام صاحب اسی حد تک صائب الرائے تھے۔[۱]"

اس کے بعد خاتمہ کا باب ہے۔ جس میں امام صاحب کے برگزیدہ تلامذہ کے حالات ہیں۔ ان میں سے بعض محدثین کے تحت آتے ہیں۔ بعض فقہا کے۔ مؤخر الذکر بزرگوں میں سے صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کے حالات خاصی تفصیل سے لکھے ہیں۔

جیساکہ علامہ شبلی نے خود وضاحت کی ہے، انھوں نے سیرت النعمان بڑی محنت اور "بہت جد و جہد" سے لکھی۔ لیکن اسے اور الغزالی کو وہ شہرت اور قبولیت عامہ حاصل نہیں ہوئی، جس کی یہ دونوں کتابیں مستحق تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں میں وہ ولولہ انگیز واقعات نہیں۔ جن سے الفاروق میں ایک ناول کی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جن سے قومی فخر و غرور کا سر اونچا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے لکھنے میں مصنف کو کچھ کم کاوش نہیں کرنی پڑی۔ بالخصوص فقہ اور کلام کے دقیق مسائل کو جس طرح سہل الفہم بلکہ دلچسپ بنا دیا گیا ہے، وہ انشا پردازی کا اعجاز ہے۔ ان کتابوں سے عوام کی بے اعتنائی اس لیے بھی افسوس ناک ہے کہ ان کی دلچسپی محض تاریخی یا ادبی نہیں۔ ان کی علمی افادیت بھی بہت ہے۔ اور ان سے آج کے مسائل حل کرنے اور ایک صائب طریق کار اختیار کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ سیرۃ النعمان ص ۱۴۱